وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (القرآن)

أَلْأَنْبِيَاءُ أَحْيَآءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ (الحديث)

(مختصر)

رِسَالَةُ الرُّوحِ

تالیف:

حضرت مولانا مفتی احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ
جامعہ عربیہ سراج العلوم سرگودھا

۷۸۶

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي



تالیف:۔ احقر احمد سعید عفا اللہ عنہ

مفتی جامعہ عربیہ مدرسۃ العلوم سرگودھا، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(حرفِ چند)

مولانا مفتی احمد سعید رحمہ اللہ سرگودھا

جامعہ سراج العلوم سرگودھا کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی احمد سعید سرگودھوی رحمہ اللہ نامور عالم دین، فقیہ اور معقولی عالم تھے۔ آپ نے رسالہ ''رسالۃ الروح'' لکھا۔ اس کا اختصار ''مختصر رسالہ روح'' کے نام پر اس مجموعہ میں شامل اشاعت ہے۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''الحمد للہ الذی خلق السموات والارض وجعل الظلمات والنور ثم الذین کفروا بربھم یعدلون۔ لایحصی عدد نعمتہ العادون ولا یودی حق شکرہ الحامدون۔ احمدہ علی الآلاء واشکرہ علی النعماء۔ واستعین بہ فی الشدۃ والرخاء واشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ واشھدان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ الامین ورسولہ السید المکین فصلی اللہ تعالیٰ علی سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی الہ واصحابہ المنتخبین وسلم وبارک الی یوم الدین امابعد الحمد والصلوۃ''

ناکارہ خلائق احقر احمد سعید عفا اللہ عنہ بخدمت احباب عرض گزار ہے کہ قاعدہ مسلمہ ہے۔ (تاریخ اپنے اوراق لوٹاتی ہے) اور ظاہر ہے کہ معاند کو جب ہی وقت کی مساعدت حاصل ہو وہ نہیں چوکتا اور اس کے عناد کا سیم فوارہ پھوٹ پڑتا ہے۔ ابلتا ہے اور زور وشور سے بہتا ہوا چاہتا ہے کہ ایک دنیا کو اپنی زد میں بہالے جائے۔ زمانہ قدیم میں معاندین اسلام یعنی فرقہائے معتزلہ وخوارج وروافض اور اہل اھواء نے اسلام کے خلاف بڑی عرق ریزی کی اور ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مگر خیر القرون اور اس کے قرب کے زمانہ میں ان کو کامیابی کیسے ہوسکتی تھی۔ ناکام ونامراد رہے اور مردود ومطرود ہوئے۔ لیکن خباثت کی تخم ریزی میں کسی حد تک کام کر گئے۔ تاریخ نے چودہ صدیوں کے عرصہ میں اب کے زمانہ کو اس تخم حنظل کے لیے مساعد پایا اور اس زمانے کو اس تخم نجاست کی بارآوری کے لیے موزوں پایا تو اوراق الٹانے شروع کیے۔

دنیا جانتی ہے اسلام میں اس زمانہ کے اندر کس قدر رخنہ اندازی کی جارہی ہے۔ دھریت ہے، پرویزیت ہے، الحاد ہے، مرزائیت ہے، رفض ہے، شیعیت ہے، رسوم وبدعات ہیں، نیچریت ہے، اور وہابیت ہے، یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اعتماد کو مجروح کیا جارہا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی حیات فی القبور کو ممنوع قرار دیا جارہا ہے شاید ان لوگوں نے متقدمین کے زمانہ گزر جانے پر میدان کو خالی دیکھا اور خم ٹھونک کر میدان میں آکھڑے ہوئے اور یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے تو اگر چاہے تو کسی ناکارہ سے بھی یہ کام لے سکتا ہے۔ وہ جتنے تھے دین کی طرف سے مدافعت کرے اور اللہ تعالیٰ کی امداد اس کی شامل حال رہے۔ ''وما ذالک علی اللہ بعزیز'' (ابراہیم: ۲۰) اسی سلسلہ میں ایک رسالہ در بارہ حقیقت روح سپرد قلم ہے جو ہدیہ ناظرین کررہا ہوں۔ ''واللہ الھادی الی سبیل الرشاد''

ناظرین کرام! بلا ریب حیات وممات عالم کا مدار روح پر ہے۔ روح سے حیات ہے اور اس کے بغیر ممات۔ قرآن مجید میں لفظ حیات تقریباً تمام عالم پر استعمال ہوا ہے۔ انسان وحیوان زندہ ہیں تو شہروں اور زمینوں پر بھی اللہ تعالیٰ نے زندہ اور مردہ کا لفظ اطلاق فرمایا ہے۔ معلوم ہوا حیات وممات کے اقسام مختلف ہیں کیونکہ بالیقین جو حیات انسان کی ہے وہ زمین وآسمان کی نہیں اور اسی طرح ممات خواہ ان اقسام میں حقیقت ومجاز کا قول کیا جائے یا اشتراک کا۔

حیات اتفاقاً امر وجودی ہے تو اگر موت ''عدم الحیات'' ہے تو عدمی ہوئی اور ان کے مابین نسبت ایجاب وسلب کی ہوگی۔ اگر بفحوائے آیۃ کریمہ ''خلق الموت والحیاۃ'' اور از روئے حدیث ذبح موت بصورت کبش اسود موت بھی وجودی ہے تو ان میں نسبت تضاد ہوگی ہر دو نسبتوں میں ایک میں تواردمن جانبین اور دوسری میں ورود

من جانب واحد ضروری ہے جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں۔ تو بمقابلہ اقسام حیات موت کے اقسام تسلیم کرنا امر بدیہی ہے۔ ورنہ ہر حیات کے لیے ایک ہی موت ہوگی اور یہ ظاہر البطلان ہے کیونکہ موت حیوانات اور موت نباتات ایک نہیں تو جیسے حیات ارض اور ہے اور حیات حیوانات اور۔ اسی طرح موت ارض اور ہے اور موت حیوان اور۔ پھر انسانوں میں حیات مومن اور حیات کافر یکساں نہیں تو ان کی موت بھی ایک جیسی نہیں۔ اسی طرح حیات شہداء وحیات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کسی کی حیات کی برابری نہیں تو ان کی موت بھی ہر موت سے جداگانہ اور علیحدہ ہے۔

اب قابل تحقیق بات یہ ہے کہ روح کیا ہے جس سے حیات حاصل ہوتی ہے۔ نیز روح سے کس طرح حیات کا ثبوت ہے۔ کیا روح جسم میں داخل ہے یا جسم کو ملاقی ہوتا ہے۔ یا بالکل خارج ہے اور تعلق روح سے حیات ثابت ہوتی ہے جیسے سورج کے تعلق سے حرارت۔

قرآن اور روح کا بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" (بنی اسرائیل: ۸۵)

امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "وقد اختلف الناس فی الروح المسؤل عنہ ای الروح ھو فقیل ھو جبریل وقیل ھو عیسیٰ... وذھب اکثر اھل التاویل الی انھم سألوہ عن الروح الذی یکون بہ حیاۃ البدن" یعنی مفسرین کا اختلاف ہے کہ کس روح کے متعلق یہ سوال تھا بعض نے حضرت جبرائیل مراد لیا اور بعض نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا اور اکثر مفسرین کا قول یہ ہے اور روح حیوانی کے متعلق سوال تھا جس سے حیات ابدان حاصل ہوتی ہے۔ (ج۱۰ص ۳۲۳)

حجۃ الاسلام میں حضرت امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے چند اہل علم نے کچھ سوالات پوچھے۔ ہر گاہ وہ سوالات اور ان کے جوابات نااہلوں کے مناسب نہیں تھے۔ مگر میں نے سائلین میں ہدایت ومعرفت کے آثار دیکھے تو ان کا التماس قبول کیا۔ اول سوال ان کا آیہ کریمہ "فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی" (الحجر: ۲۹) کے متعلق تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور بنی آدم میں تسویہ سے کیا مراد ہے؟ تو اجمالی جواب یہ ہے کہ کسی محل کا کسی موثر کی تاثیر قبول کرنے کے قابل ہونا تسویہ کہلاتا ہے۔ تو حضرت آدم کے لیے مٹی کا خمیر اور بنی آدم کے لیے نطفہ وہ محل ہے جو روح انسانی کا متحمل ہے اس کے اعتدال اور قابلیت تحمل کو تسویہ کہا جائے گا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ظاہر ہے ہر خشک چیز آگ کا شعلہ نہیں پکڑتی۔ جیسے مٹی اور پتھر اور ہر تر چیز بھی آگ کی متحمل نہیں جیسے پانی بلکہ اقتباس شعلہ کی قبولیت مرکب شئی میں ہوتی ہے اور پھر ترکیب بھی خاص۔ ولہٰذا کیچڑ مٹی اور پانی سے مرکب ہے مگر آگ کو قبول کرنے کا اہل نہیں۔

چراغ کی بتی اگر خشک ہو تو آگ کو تھامنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ادھر آگ لگی ادھر وہ جل کر راکھ ہوئی

اور تیل پلائی ہوئی روغن دار بتی شعلہ کو تھامنے کی استعداد رکھتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے مختلف اقسام کی مٹی جمع کی گئی۔ جس طرح احادیث میں منصوص ہے تو ان میں اختلاط و اعتدال پیدا کرنا پھر اعضاء کی تخلیق پھر اس مجسمہ کا خشک ہوکر کالفخار ہونا اور اس میں قابلیت پیدا کرنا کہ نفخ روح ہوتے ہی وہ اپنی حقیقت ارضی کو چھوڑ کر گوشت، پوست میں منقلب ہوجائے۔ یہی تسویہ ہے کہ اب وہ مجسمہ خاکی روح کا متحمل ہوسکتا ہے۔

ایسا ہی بنی آدم غذائے صالح کھاتے ہیں اور اس سے خون پیدا ہوتا ہے تو بقول اطباء بہتر ساعت کے بعد خون سے نطفہ بنتا ہے اور وہ بھی اس خون سے جو اعتدال کے قریب ہوتا ہے۔ پھر جب یہ نطفہ رحم مادر میں جاتا ہے اور عورت کے نطفہ سے باہم مختلط ہوتا ہے تو اس میں پہلے سے زیادہ اعتدال پیدا ہوجاتا ہے اور پھر بچہ دانی کی حرارت سے وہ نطفہ خون کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جس کو قرآن حکیم نے "علقة" فرمایا ہے۔ پھر بعد میں قدرے کثافت و سختی اور خشکی پیدا ہوتی ہے تو اس کو کلام الٰہی نے "مضغة" سے تعبیر فرمایا۔ یعنی گوشت کا ٹکڑا پھر اس کو "مخلقة" یعنی تام الخلق یا "غیر مخلقة" حسب ارادہ خداوندی بنایا جاتا ہے اور اس میں تمام اعضاء، عظام، غضاریف، اعصاب و رباطات وغیرہ مکمل کیے جاتے ہیں پھر پوست کی پوشش سے گوشت کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ تو اب وہ نطفہ ان تغیرات و انتقالات کے بعد اعتدال کی نہایت کو پہنچتا ہے اور اس قابل ہوجاتا ہے کہ اگر اب نفخ روح ہو تو نطفہ اس کو تھام لے گا اور روح بھی اب اس میں تصرف کرے گی۔ اولاد آدم کے حق میں یہی تسویہ ہے۔

پھر چونکہ ہر مخلوق اپنی اپنی استعداد کے موافق وجود میں آتی ہے تو روح کے اقسام مخلوقات کے اعتبار سے مختلف ہوئے مثلاً کہیں استعداد فقط روح نباتاتی کی ہے جیسے اشجار اور کہیں روح حیوانی کا تحمل بھی ہے جس طرح حیوانات اور کہیں روح انسانی بھی متصرف ہے جس کو مناطقہ نفس ناطقہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کو صوفیاء کرام نے لطیفہ روح کہا اور اسی کو قرآن مجید نے نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کے اقسام میں تقسیم فرمایا ہے۔ بہرحال اثرات اور تعلقات کا فرق ہے اور اسی بنا پر روح کی تقسیم ہوئی ورنہ حقیقت روح ایک چیز ہے جس کو من امر ربی فرمایا گیا۔ مگر جس طرح سورج کی شعاع سے وہی چیز روشن ہوتی ہے جو رنگ دار ہوتی ہے اور پھر جس قسم کا رنگ ہوگا اور جس قدر رنگ ہوگا اسی قدر وہ چیز روشنی قبول کرے گی اور جس شئے کا کوئی رنگ ہی نہیں جیسے ہوا تو اس میں روشنی قبول کرنے کی اہلیت ہی نہیں زنگ آلود لوہا اور صیقل شدہ کو دیکھ لو اور فرق ظاہر ہے اور ہوا اگرچہ حرارت شمسی سے گرم ہوجاتی ہے مگر رنگت نہ ہونے کی وجہ سے روشن نہیں ہوتی اسی لیے تو نظر نہیں آتی اگر پہاڑوں اور مکانوں پر روشنی نہ پڑتی تو کرہ ہوا ہمیشہ اندھیرے میں رہتا۔

اسی طرح روح کی نورانی شعاعیں حسب استعداد ہر چیز پر وارد ہوتی ہیں اور جس شئی کی جس قدر استعداد ہوتی ہے۔ اسی قدر وہ اثر لیتی ہے۔ اشجار نے صرف نباتاتی اثر لیا اور حیوانات نے حیوانی اثر بھی قبول کیا تو حساس و متحرک ہوئے اور انسان نے روح انسانی کا اثر بھی تھاما تو مدرک کلیات ہوا۔

حقیقت روح

لفظ روح کا اطلاق مختلف معانی پر ہوتا ہے۔ روح نفسانی، روح طبعی، روح نباتاتی۔ حضرت روح الامین

یعنی جبرائیل۔ وحی ربانی "وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا ای وحیا" اور روح انسانی جس کو نفس ناطقہ کہا گیا ہے۔ اس رسالہ میں اسی سے بحث کرنا مقصود ہے۔ یہی مدرک کلیات ہے اور اسی پر مدار تکلیف ہے اور اسی کی اصلاح سے تقرب الی اللہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے متعلق قدماء سے مختلف اقوال منقول ہیں۔

محققین مشائین اشراقیین کا قول ہے کہ نفس ناطقہ جوہر لطیف ہے جو کہ غیر منقسم ہے یعنی بسیط ہے۔ مدبر بدن ہے اور محافظ ترکیب ہے۔ مکان اور جہت سے پاک ہے۔ بدن میں نہ داخل ہے نہ خارج اور نہ بدن سے متصل ہے نہ منفصل ہے۔ یعنی یہ امور صفات روح میں سے نہیں اور نہ روح اپنی تدبیر میں ان کا محتاج ہے بلکہ اس کا تعلق بالابدان ایسے سے ہے۔ جیسے شعاع شمسی کا تعلق اور اس تعلق سے وہ ابدان میں تصرف کرتا ہے اور اسی ابدان اور تدبیر کا نام حیات ہے اور عدم تصرف اور تعطیل تدبیر کا نام ممات ہے۔ اسی قول کو ابوزید دبوسی اور الامام الراغب الصفہانی اور حجۃ الاسلام الامام الغزالی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے اور امام غزالی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اہلسنت والجماعۃ کا قول فرمایا ہے اور محققین صوفیاء کا بھی یہی قول ہے۔

مولانا مفتی شاہ دین صاحب خلیفہ اعظم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ شرح رسالہ روح میں فرماتے ہیں کہ صاحب کشف حضرات کا کشفی مشاہدہ بھی اسی پر منتہی ہوتا ہے۔

حجۃ الاسلام الامام الغزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ترجمہ: روح انسانی ایک جوہر لطیف ہے جو نہ ذو مکان ہے اور نہ ذو جہت۔ نہ بدن میں داخل ہے اور نہ خارج۔ بدن سے متصل ہے اور نہ منفصل یعنی یہ امور اس کی صفات لازمہ سے نہیں اور نہ ہی اپنے تصرف میں ان کا محتاج ہے بلکہ حیات ابدان اس کے تعلق سے وابستہ ہے اور اسی تعلق سے وہ ابدان میں تصرف کرتا ہے اور انقطاع تعلق وتعطل تصرف کا نام موت ہے۔ مدار حیات وممات ابدان دخول روح اور خروج روح پر نہیں اور روح انسانی بواسطہ روح حیوانی ابدان کا مدبر اور اجسام میں متصرف ہے۔ انتہی (ازالہ اوہام)

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کی کلام میں چند شبہات تھے جن کا ازالہ خود حضرت امام رحمہ اللہ نے فرمایا۔ فرماتے ہیں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر روح ابدان میں نہ داخل ہے اور نہ خارج تو ارتفاع ضدین لازم آ گیا۔ جو محال ہے۔ اس لیے کہ مراد یہ ہے کہ تصرف روح کے لیے دخول وخروج کی ضرورت نہیں بلکہ روح ہر دو حالتوں میں تصرف کرتا ہے اگرچہ واقعہ میں روح یا ابدان میں داخل ہے یا خارج۔ مگر تصرف وتدبیر میں ان معنوں کا دخل نہیں یعنی حیات ابدان دخول روح پر موقوف نہیں اور موت اجسام خروج سے نہیں بلکہ تصرف وعدم تصرف کا نام حیات وممات ہے۔

قارئین کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے حضرت نبی کریم ﷺ کی وفات کے متعلق یہی بات فرمائی تھی کہ حضور اکرم ﷺ کا روح مبارک بوقت موت آپ کے قلب منور میں منقبض کر دیا گیا تھا۔ جس سے روح کا تصرف منقطع ہو گیا اور عدم تصرف روح کا نام موت ہے نہ یوں کہ آپ ﷺ کے روح مبارک کا اخراج کیا گیا ہو اور اس بات سے ہمارے معاصرین نے بڑا تعجب کیا اور اس کو خرق اجماع کہہ دیا حالانکہ صدیوں قبل حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "تہافت فلاسفہ" میں اسی معنی کو بیان فرمایا اور نص فرمائی کہ یہی معنی موت اہلسنت والجماعت کا صحیح قول ہے۔ اسی لیے تو قطب ربانی ابوحنیفہ ثانی حضرت مولانا

رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کی تائید فرمائی مگر۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

والی بات برحق ہے۔ جس شخص کا مبلغ علم محدود ہو اور عقیدت نامسعود تو وہ بلا شک یہی کہے گا جو ہمارے ایک معاصر نے اپنی کتاب میں کہا۔

(اس فتویٰ کے مطابق مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہنا چاہیے آپ کا بیان کردہ معنی موت متقدمین ومتاخرین میں سے کسی نے نہیں سمجھا اور نہ کیا۔ تو یا تو فتویٰ ص ۲۰۴ کے مطابق نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا معنی مردود ہے اور رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مردود تحقیق کی تائید جو کی ہے وہ بھی مردود ہے۔) اور اس سے قبل ص ۶۴ پر لکھا ہے (اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو بھی کسی نے نہیں اپنایا) بڑے تعجب کی بات ہے کہ مسلک اہلسنت والجماعت کا علم نہیں اور تصنیف کا شوق اس حد تک کہ نفوس قدسیہ پر تنقید کی جارہی ہے۔

ہر بوالحوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوہ اہل وفا گئی

کیسے معصومانہ انداز میں تحریر کر دیا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو بھی کسی نے نہیں اپنایا۔ حالانکہ اسی مسلک کو حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ مسلک اہل سنت فرما رہے ہیں اور محققین کا قول قرار دے رہے ہیں۔ پھر حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے شبہ ارتفاع ضدین کا منطقی طور پر جواب دیا۔ فرماتے ہیں: ارتفاع ضدین کے محل سے محال ہے جو احد الضدین کا محل بن سکے اور جو محل ہر دو ضدین میں سے کسی کا محل بھی نہ ہو تو اس سے ارفاع ضدین درست ہوتا ہے۔ دیکھئے پتھر کو اگر عالم نہیں کہہ سکتے تو اسے جاہل بھی نہیں کہیں گے کیونکہ علم وجہل کے لیے حیات شرط ہے۔ تو جب کہ حجر میں حیات نہیں یعنی روح حیوانی نہیں تو حجر علم وجہل کا محل بھی نہیں تو جب یہ ان کا محل نہیں تو اس سے رفع ضدین محال بھی نہیں کیونکہ ارتفاع ضدین ان کے محل سے محال ہے اور روح انسانی صفت دخول وخروج کا محل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر روح کو ابدان میں داخل کیا جائے تو پھر یہ ذو مکان ہوا اور ہر ذو مکان تقسیم قبول کرتا ہے اور نہیں تو بواسطہ مکان ہی سہی۔ کیونکہ مکان کہتے ہیں سطح باطن حاوی کو جو سطح ظاہر محوی کے مماس ہو اور بلا ریب سطح مماس اور غیر مماس جدا حیثیت رکھتی ہیں تو تقسیم ثابت ہوئی حالانکہ روح جو ہر بسیط ہے اس میں تقسیم نہیں ہے لہٰذا روح ذو مکان نہیں تو جب ذو مکان نہیں تو داخل نہیں رہا تو دخول اس کی صفت نہیں تو خروج کیسے ہوگا۔

پھر یہ وہم نہ کیا جائے کہ روح انسانی جوہر ہوتے ہوئے تقسیم قبول نہیں کرتا تو جوہر فرد ثابت ہو گیا جس کو جزو لا تجزیٰ کہا جاتا ہے اور تم اس کے بطلان کے قائل ہو اس لیے کہ جز لا تجزی وہ جوہر ہے جو متحیز بھی ہو اور تقسیم قبول نہ کرے اور جو ذو مکان نہیں اس کے استحالہ کا قول کسی نے بھی نہیں کیا اور نہ اس کو دیمقراطیس جز لا تجزی کہتا ہے نیز یہ گمان بھی نہ کیا جائے کہ روح لا مکان ہوا تو اس سے صفات باری میں شریک ہونا لازم آ گیا۔ اس لیے کہ غیر ذی جہت ہونا اور لا مکان ہونا اللہ کی صفات حقیقیہ محضہ میں سے نہیں بلکہ یہ صفات حقیقیہ ذات اضافت ہیں یا اضافیہ محضہ ہیں اور شرک صرف صفات حقیقیہ محضہ میں محال ہے اور اس کا قول کفر ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمع بصر، علم، تکلم، قدرت وغیرہ صفات عطا فرمائی ہیں اور خود سمیع، بصیر، علیم، متکلم، قادر ہے لیکن اس اشتراک لفظی سے شرک لازم نہیں آتا، کیونکہ یہ صفات اللہ میں

ذاتی ہیں اور اسباب وآلات کے محتاج نہیں اور ان ہی کو صفات حقیقیہ محضہ کہا جاتا ہے اور مخلوق میں یہ صفات غیر ذاتی ہیں اور اسباب وآلات کے محتاج ہیں۔ اسی طرح روح کا عدم احتیاج مکان من جانب تخلیق اللہ ہے بذات خود نہیں۔

اسی معنی پر حدیث محمول ہے جس کے الفاظ ہیں "ان اللہ خلق آدم علی صورتہ" صورت سے مراد شکل تو نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم وشکل سے منزہ ہے تو مراد صفات ہیں اور لفظ صورت جیسے صورت محسوس پر اطلاق پاتا ہے۔ ایسی ہے صورت مرتسمہ فی الذہن پر بھی بولا جاتا ہے مثلاً صورت مسئلہ یوں ہے اور صورت واقعہ ایسی ہے تو حدیث شریف میں صورت سے مراد صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر انسان ہے تو اس کے صفات کی مثال انسان میں موجود ہے مگر اس کی صفات کی مثل کہیں اور نہیں ہو سکتی کہ وہ ذات اور صفات ہر دو میں لاشریک ہے۔ مثل اور مثال میں بڑا فرق ہے۔ ایک مثل دوسری مثل کے مساوی ہوتی ہے اور مثال مساوی نہیں ہوتی فقط ایک عکس ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات کی مثل ممتنع اور محال ہے اور مثال موجود ہے کہ مثال کسی ادنیٰ مناسبت اور مشابہت کی بنا پر مثال ہو سکتی ہے۔ حدیث شریف میں علم اور اسلام کی مثال دودھ بتائی گئی ہے اور قرآن مجید اور دین اسلام کی مثال حبل یعنی (رسا) سے پیش کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا" (آل عمران: ۱۰۳) تو ظاہر ہے کہ یہاں ایک کو دوسری کی مثال ادنیٰ مناسبت کے اعتبار سے بنایا گیا ہے کہ دودھ غذائے جسمانی ہے اور اسلام وعلم غذائے روحانی۔ ایسے ہی حوائج دنیاوی میں رسے کو مضبوط پکڑنا ہوتا ہے اور آخرت کی نجات کے لیے اللہ کے رسے کو خوب تھامنا ہوگا۔ تو یہ آپس میں ایک دوسرے کی مثال ہیں۔ مثل نہیں ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی مثل کی نفی فرمائی ہے اور مثل کو ثابت فرمایا ہے۔ ارشاد ہے "لیس کمثلہ شیء" (الشوریٰ: ۱۱) ادھر دوسری جگہ ارشاد ہے "مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح" (النور: ۳۵) تو اللہ تعالیٰ کے صفات کی مثل اور مثال پیش کی جا سکتی ہے اور اس کی صفات کی مثل نہیں ہے تو روح کی لامکانیت بھی اسی طریقہ پر ہے۔

خلاصہ

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حقیقت روح کے متعلق فقط اتنا کہا جا سکتا ہے کہ روح انسانی ایک جوہر مجرد ہے جو بواسطہ روح حیوانی بدن کا مدبر اور اس میں تصرف کرتا ہے اور اس کے تصرف کا نام حیات ابدان ہے اور تعطل تصرف اور انقطاع تعلق از ابدان کا نام موت ہے۔ موت وحیات اجسام دخول روح اور خروج روح سے نہیں بلکہ تعلق وتصرف اور عدم تعلق وتصرف پر موت وحیات کا دارومدار ہے۔ دیکھئے بوقت نیند اللہ تعالیٰ نے قبض روح اور امساک روح کا ذکر فرمایا۔ جس طرح موت کے وقت قبض روح اور امساک روح مذکور فرمایا۔ "اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا" (الزمر: ۴۲)

مگر بوقت نوم باوجود اخراج روح کے حیات ابدان باقی ہے۔ کیونکہ روح کا تعلق اور تصرف بدن میں باقی ہے اور اس تصرف کے لیے قرب وبعد کوئی چیز نہیں۔ روح کے لیے قرب وبعد یکساں ہیں۔ ہزاروں میل کا فاصلہ ہو تو بھی وہی تصرف ہوگا جو بوقت دخول بدن ہوگا۔ اسی تحقیق کے مطابق حجۃ الاسلام حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی ﷫ نے بیان فرمایا کہ حضرت خاتم النبیین ﷺ کی روح پر فتوح کو بوقت موت

خارج نہیں کیا گیا بلکہ قلب مبارک میں منقبض کر دیا گیا۔ جس سے تصرف روح ختم ہو گیا اور تعطل تصرف موت ہی ہے اور صدیوں قبل حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی ﷫ نے اسی تحقیق کو حقیق بالقبول فرمایا اور مسلک اہلسنت فرمادیا۔ تو ان ہر دو محسنین کی تحقیق کو بجا طور پر حجۃ اللہ البالغہ کہا جائے گا اور حضرت قطب ربانی ابوحنیفہ ثانی ﷫ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ﷫ کی تائید سونے پر سہاگہ کا کام کر گئی۔

پر کیا کریں کہ جب کہ یہ تحقیق ہمارے زمانہ کے حضرات کو سمجھ میں آسکی یا طبع آزاد کو پسند نہ آئی تو اسے مردود کہہ دیا اور فرمان نبوی "من لعن شیئا لیس له باهل رجعت اللعنة علیه" کا خیال تک نہ آیا۔

بہر حال یہ موضوع بہت دقیق بلکہ ادق ہے۔ ایسے مقام پر عقول متوسطہ کو سپر ڈالنا پڑتا ہے۔ یہاں نفوس قدسیہ کی سنی پڑتی ہے جو کچھ اصحاب نفوس قدسیہ کی کلام میں سے اس عاجز نے اپنی بساط کے موافق سمجھا وہ عرض کر دیا۔ یقیناً مقام کے کئی گوشے تشنہ تکمیل ہوں گے مگر میری عقل نارسا کی پرواز وہاں تک نہ تھی پھر بھی امید ہے کہ جس قدر بیان ہوا غالباً اس میں کفایت ہوگی۔ "والعلم عند اللہ سبحانه وعلمه اتم۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبه محمد وعلی آله واصحابه اجمعین۔ والحمد للہ رب العالمین"

الاحقر، احمد سعید عفی عنہ
مفتی جامعہ عربیہ سراج العلوم سرگودھا
۱۲ رجمادی الآخر ۱۴۰۱ھ / ۱۸ اپریل ۱۹۸۱ء